بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

پاکستان کے ایک سرکاری جریدے میں جو ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے تحت شائع ہوتا ہے کسی صاحب کی طرف سے صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب کے نام ایک مکتوبِ مفتوح شائع ہوا ہے جس میں پہلے تو مکتوب الیہ کی مدح و توصیف ہے، اس کے بعد اُن کے ذہن میں یہ خیال بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس ملک میں فتنوں کا اگر کوئی سرچشمہ ہے تو وہ دینی عناصر ہیں، پھر ان میں بھی خاص طور پر ایک خاص عنصر کو ہدفِ ملامت بنایا گیا ہے اور صدر صاحب کو نہ صرف اس عنصر کے "عزائم" سے خبردار کیا گیا ہے بلکہ انہیں اس بات کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس کے قلع قمع کرنے کی جلد از جلد فکر کریں۔

صدرِ مملکت اپنے اس "مشیر" اور "بہی خواہ" کے مشوروں کو کس حد تک درخورِ اعتناء سمجھتے ہیں، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مگر اس خط سے دلوں کی کدورت، اور دینی عناصر کے خلاف بغض و کینہ اور حسد و عداوت کی آگ، اور خاص طور پر جماعت اسلامی کے متعلق شدید نفرت و بیزاری اور اُسے نیست و نابود کر دینے کی خواہش اس خط کے ایک ایک لفظ سے جھلکتی ہے۔

اگر یہ محض ایک شخص کے خیالات ہوتے تو ہم قطعاً نوٹس نہ لیتے۔ مگر یہ "عام آدمی" جنہیں عوام کے قریب رہنے کا دعویٰ ہے، انہوں نے ایسی باتیں کی ہیں جو عوام کے دکھ درد، ان کی مشکلات، ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا ترجمان ہونے کے بجائے ایک نہایت ہی مختصر سے مغرب زدہ طبقے کے خیالات کی ترجمان ہیں۔ مکتوب نگار اس بات کے دعویدار ہیں کہ وہ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ ایک عام آدمی کے مشاہدہ و مطالعہ کا نتیجہ ہے، جس کے ذہن پر کسی مخصوص سیاسی مسلک کا اثر نہیں۔ مگر جو باتیں انہوں نے

ارشاد فرمائی ہیں انہیں دیکھ کر اُن کے دعوے کی خود بخود تردید ہو جاتی ہے۔ معلوم نہیں یہ صاحب عوام میں سادہ ذہن کے ساتھ کہاں گھومتے پھرے ہیں کہ انہیں عوام کی دینی عناصر کے خلاف نفرت کا علم ہوا؟ ہم نے تو عوام کو جہاں بھی دیکھا انہیں مغرب زدہ طبقے اور اسلام کے اندر اُس کی رخنہ اندازیوں کے خلاف شدید غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہوئے پایا۔ بعض لوگوں کو دینی عناصر کے بعض افراد سے اختلاف ہو سکتا ہے، مگر دینی رہنمائی کے لیے عوام نے "مُلّا" کو چھوڑ کر کبھی بھی "مسٹر" کی پیروی نہیں کی۔ "مُلّا" جس کو دین سے بغض و عداوت رکھنے والے طبقوں نے بالکل ایک گالی بنا کر رکھ دیا ہے، آج بھی عوام کی توجہ کا مرکز ہے۔ وہ حلال کو حرام سے ممیّز کرنے کے لیے جائز و ناجائز کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنے کے لیے، حق اور باطل کے مابین فرق کرنے کے لیے، عبادات اور معاملات میں شریعت کے احکام معلوم کرنے کے لیے ہمیشہ "مُلّا" ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اسی کی بات پر اعتماد کرتے ہیں۔

دوسرے ممالک کو تو فی الحال نظر انداز کیجیے، صرف پاک و ہند میں جو نامور مسٹر پیدا ہوئے ہیں اُن کی فہرست پر ایک نگاہ ڈالیے اور پھر دیکھیے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی امّت نے مفتی تسلیم کیا ہے؟ سرسیّد کو قوم سے جو محبت اور دین سے جو وابستگی تھی اُس سے کسے اختلاف ہو سکتا ہے۔ انہوں نے دین کی حمایت میں بعض قیمتی چیزیں بھی لکھیں اور امّت نے اُن کے کام کو سراہا بھی۔ مگر عقائد اور احکام کے کسی مسئلے میں بھی ان کا فتویٰ جاری نہ ہو سکا۔ سیّد امیر علی، مولوی چراغ علی، نواب محسن الملک اپنی ساری فضیلت اور خدمات کے باوجود یہ مقام حاصل نہ کر سکے۔ ان کے کام کو جو لوگ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اُن کو بھی جب کسی معاملے میں اللہ اور اُس کے رسُول کا حکم معلوم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے اپنے ملک کے معروف علماءِ دین ہی کی طرف رجوع کیا۔ خالص دینی معاملات تو ایک طرف رہے، آپ کی یہ تحریکِ پاکستان بھی اُس وقت تک عوام میں مقبول نہ ہو سکی جب تک مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور اسی طرح کے دوسرے "ملاؤں" نے اس کے حق میں فتوے صادر نہ کیے۔

علامہ اقبالؒ کی روشن دماغی، ملت سے خیر خواہی، دینی بصیرت اور جدید تقاضوں کی سمجھ بوجھ میں کسے شک ہو سکتا ہے؟ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انہیں بھی کسی دینی مسئلے کے سمجھنے میں جب کوئی دقت پیش آتی ہے تو وہ سر راس مسعود، یا سر اکبر حیدری، یا خود قائداعظم سے استفسار کرنے کے بجائے ملائی نظام کے ایک چشم و چراغ علامہ سید سلیمان ندویؒ پر اعتماد کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ ان "ملاؤں" کے کس قدر گرویدہ تھے اس کا اندازہ مکاتیب اقبالؒ سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔

"ملا" کو ختم کرنے کے لیے حکومت کیا تدابیر اختیار کرتی ہے اور اُس کے بہی خواہ اس کے سامنے کیا تجاویز پیش کرتے ہیں، ہمیں اس وقت اس سے کوئی بحث نہیں۔ ہم دیانتداری سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس خط میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ درحقیقت کسی عام آدمی کے احساسات نہیں بلکہ خود برسر اقتدار طبقوں کی خواہش الفاظ میں ڈھل کر قرطاس پر آگئی ہے۔ اس مکتوب میں جتنی باتیں قلمبند کی گئی ہیں وہ سب وہی ہیں جو وقتاً فوقتاً ایوانِ اقتدار سے لب و لہجے کے فرق کے ساتھ کہی جاتی رہی ہیں۔ اس میں جو کچھ خوبی ہے وہ صرف یہ کہ یہ خط مغرب زدہ طبقے کے بجائے اس وقت دنیائے اسلام میں اقتدار بھی حاصل ہے، عزائم اور ارادوں کو پوری طرح بے نقاب کرتا ہے۔ خط کے تیور بھی یہ صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ کسی عام آدمی کا انداز بیان نہیں ہو سکتا۔ اس کی زبان، اس کا اسلوبِ نگارش، اس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے کہ اس پردۂ زنگاری میں کوئی خاص شخصیت چھپی بیٹھی ہے۔ پھر اس میں جتنے مشورے بھی دیئے گئے ہیں وہ ایک خاص گروہ پہلے سے دیتا چلا آرہا ہے۔ یہی مشورے لیاقت علی خان مرحوم کو دیئے گئے، پھر اسی نوعیت کی گزارشات غلام محمد اور سکندر مرزا کی بارگاہ میں پیش کی گئیں، اور آج یہی معروضات محمد ایوب خاں صاحب کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں۔ ان مشوروں پر عملدرآمد ہوتا ہے یا نہیں، اور ان مشوروں پر عمل پیرا ہو کر بیچارے "ملا" کو کس حسرتناک انجام تک پہنچایا جاتا ہے، اس کے بارے میں کوئی بات بھی وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ ہم تو صرف اللہ تعالیٰ سے دعا کر سکتے ہیں کہ وہ مسلم ممالک کے برسر اقتدار طبقوں کو سمجھ بوجھ عطا کرے اور انہیں غلط

مشیروں کے فریب سے بچائے۔ البتہ مسلمانوں کے سوچنے سمجھنے والے حلقوں کی خدمت میں ہم چند باتیں پیش کرتے ہیں تاکہ وہ ان پر غور کریں۔

پہلی بات جس پر انہیں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے وہ یہ ہے کہ یہ نہایت ہی مختصر سا مغرب زدہ طبقہ آخر "ملا" کے درپے آزار کیوں ہے؟ اس خط میں جس سبب کی نشاندہی کی گئی ہے وہی درحقیقت اصل پریشانی ہے جو اس طبقے کو کھائے جا رہی ہے۔ "ملا" ان لوگوں کے نزدیک "ہر ضروری اور مفید پروگرام اور تجویز کو غیر شرعی اور غیر اسلامی قرار دے کر عوام کو اس کے خلاف اکساتا ہے"۔ اپنے اس دعوے کی تائید میں خاندانی منصوبہ بندی اور عائلی "اصلاحات" کی ناکامی کو پیش کیا گیا ہے۔

پریشانی کی دوسری وجہ "ملا" کا معاشرے میں غیر معمولی اثر و رسوخ ہے۔ مکتوب نگار کا یہ صدمہ لاحق ہے کہ ہمارے علماء اور ائمہ اور خطباء کا عوام سے براہِ راست تعلق ہے۔ بڑے بڑے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے اور معمولی دیہات تک مساجد کا جال بچھا ہوا ہے۔ ہر قریہ اور بستی اور اس کا ہر محلہ اس نظام سے وابستہ ہے۔ مساجد و مدارس پر ان حضرات کا قبضہ ہے۔ روزانہ پانچ وقت کی نمازوں کے چھوٹے چھوٹے اجتماعوں سے لے کر جمعہ و عیدین کے عظیم الشان اجتماعات تک یہی حضرات عوام سے متعلق اور ان سے مخاطب رہتے ہیں۔ اس طرح ان کے قائم کردہ اس "ملائی نظام" کی قوت میں حیرت انگیز اضافہ ہو جاتا ہے۔ مکتوب نگار کے الفاظ میں یہ ایک حکومت در حکومت ہے۔

یہ دو ہیں وہ اصل اسباب جن کی وجہ سے "ملا" اس مغرب زدہ اقلیت کی آنکھ میں خار بن کر کھٹک رہا ہے۔

اب دیکھیے کہ جو الزام تراشی "ملا" پر کی جا رہی ہے وہ کس حد تک درست ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ملا حکومت کے ہر ضروری اور مفید پروگرام اور تجویز کو غیر شرعی اور غیر اسلامی قرار دے کر عوام کو اس کے خلاف اکساتا ہے۔ مگر جب ہم "ملا" کے طرزِ عمل کا غیر جانبداری سے جائزہ لیتے ہیں تو ہم اُسے اس الزام سے بالکل بری الذمہ پاتے ہیں بلکہ ہمیں تو یہ دکھائی دیتا ہے کہ ملا ہر مفید پروگرام کی دل و جان سے حمایت کرتا ہے اور بغیر کسی طمع اور لالچ کے اُسے کامیاب بنانے میں حکومت کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد حکومت نے سینکڑوں نئے منصوبے بنائے ہیں اور ان کی تکمیل پر کروڑوں روپے صرف کیے ہیں۔ مگر ملا نے اُن کے خلاف کبھی ایک لفظ تک نہیں کہا۔ لاتعداد پُلوں اور بندوں کی تعمیر، ہزاروں نہیں لاکھوں ٹیوب ویلوں کی تنصیب، فوج کی تعداد میں معتدبہ اضافہ اور اُسے جدید ترین آلاتِ حرب سے مسلح کرنے کی مختلف تجاویز، نئے نئے ہسپتالوں، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قیام کے متعدد منصوبوں میں آخر وہ کونسا ایسا منصوبہ ہے جس کی "ملا" نے کبھی مخالفت کی

ہو ؟ ہماری نظر سے آج تک سرکاری اور غیر سرکاری اخبار کے کسی کالم میں کوئی ایسی خبر نہیں گزری جس میں "ملا" نے ان پروگراموں پر بیزاری کا اظہار کیا ہو۔ یہاں بڑے بڑے شہروں کے اطراف میں اضافی بستیاں قائم کی گئیں طبیعی علوم کی تحقیق کے لیے مختلف مقامات پر معمل اور تجربہ گاہوں کا قیام عمل میں لایا گیا، مگر "تنگ نظر ملا" کی زبان سے شکایت کا ایک لفظ سننے میں نہیں آیا۔ بلکہ ہم نے تو "ملا" کو ان معاملات میں "مسٹر" سے کہیں زیادہ وسیع الظرف اور عالی حوصلہ پایا ہے۔ "مسٹر" نے اقتدار کے بل بوتے پر جدید طب وجراحت کی عملداری قائم کرنے کے ساتھ اس امر کی پوری کوشش کی کہ طب اسلامی نہ صرف حکومت کی تائید سے یکسر محروم ہو جائے بلکہ اُس کے لیے زندہ رہنا بھی ناممکن بنا دیا جائے۔ مگر "ملا" نے اس بے جا تعصب اور صریح زیادتی کو محض اس بنا پر خاموشی کے ساتھ برداشت کیا کہ طب جدید کے علمبردار خواہ طب اسلامی کے کتنے ہی مخالف ہوں مگر چونکہ جدید انکشافات کی وجہ سے یہ طریق علاج بعض پہلوؤں سے زیادہ موثر اور کار آمد ہے اس لیے اسے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا ضرور موقع دیا جانا چاہیے۔ یہاں کتنے سکول اور کالج نوخیز نسلوں کو مغربی تعلیم سے بہرہ مند کرنے کے لیے کھلے ہوئے ہیں اور اُن پر خزانۂ سرکار کی اس آمدنی کا کروڑوں روپیہ صرف ہو رہا ہے جس کی فراہمی میں "ملا" کا حصہ بھی ہے۔ "ملا" نے اس پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ مگر اس کے مقابلے میں عالی ظرف "مسٹر" کو یہ بات بھی گوارا نہیں ہے کہ "ملا" حکومت کے خزانے پر ایک پائی کا بوجھ ڈالے بغیر صرف عوام کے چندوں سے دینی تعلیم کی ترویج کا انتظام کرے اور روکھی سوکھی کھا کر دینی مدرسے چلائے۔ اور اس کو بند کرنے کے لیے بھی جو طریقہ یہ لوگ تجویز کرتے ہیں وہ یہ نہیں ہے کہ دلائل سے اپنی قوم کو ان مدارس کی عدم افادیت کا قائل کر دیں بلکہ یہ بلند حوصلہ لوگ صدا یوں ہی کہتے ہیں کہ آپ طاقت استعمال کر کے ان کا خاتمہ کر دیں۔

ان حقائق اور شواہد کی موجودگی میں یہ کہنا کہ "ملا" حکومت کے ہر مفید اور ضروری پروگرام کی مخالفت کرنے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے ایک بالکل بے بنیاد الزام ہے۔ ان مغرب زدہ حضرات نے "ملا" کی جو فرضی تصویر کشی کی ہے اُس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ "ملا" کو اگر کوئی دنیا میں کام ہے تو وہ صرف یہی کہ وہ ہر معقول بات کو غیر شرعی اور غیر اسلامی کہہ کر عوام کے جذبات کو برانگیختہ کرتا رہے۔

مگر حالات کے مشاہدے سے "ملّا" کے انداز فکر کا جو رُخ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ جب کسی بات کو صریحاً شریعت کی رُو سے غلط سمجھتا ہے تو اُسے غلط کہتا ہے اور جب اُسے کسی درجہ میں بھی شرعاً صحیح سمجھتا ہے تو اُس کی تائید کرتا ہے۔ "ملّا" کتنا حقیقت پسند ہے اس کے لیے کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہیں، صرف تعصّب کو بالائے طاق رکھ کر حالات کا مطالعہ حقیقت کو پُوری طرح منکشف کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر صرف فوج کے بارے میں ملّا کے طرزِ عمل کو دیکھیے۔ پاکستان کے قیام سے پہلے ملّا انگریزی فوج میں ملازمت کو پُوری قوت اور جرأت کے ساتھ حرام کہتا رہا اور حق گوئی کی پاداش میں اُس نے بڑی بڑی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ کیونکہ اُس کے سامنے ہادیٔ برحق کا یہ فرمان تھا کہ جو شخص کفر کے جھنڈے کے تحت یا اُس کی سربلندی کے لیے مرا اُس نے جاہلیت کی موت پائی۔ مگر جس روز پاکستان معرضِ وجود میں آیا اور انگریز کی غلامی سے نجات حاصل ہوئی، اُسی وقت سے اُس نے فوج کی ملازمت کو نہ صرف جائز قرار دیا بلکہ اس کی خدمت کو بہت بڑی نیکی سے تعبیر کیا۔ فوج کو بڑھانے، اُسے ترتیب دینے اور اُسے جدید ترین اسلحہ سے مسلح کرنے کے بارے میں اُس نے حکومت کی ہمیشہ دل و جان سے تائید و حمایت کی۔

یہ معاملہ خود اس ملک کے سوچنے سمجھنے والے دماغوں کی توجہ کا طالب ہے کہ آخر یہ "ملا" جب سینکڑوں منصوبوں اور پروگراموں کی حمایت کرتا ہے تو خاندانی منصوبہ بندی، عائلی قوانین، سُودی نظام، رقص و سرود کی ثقافت، شراب نوشی، قمار بازی، مخلوط تعلیم اور اسی نوعیت کے دوسرے کاموں پر کیوں تنقید کرتا ہے اور ان معاملات میں کیوں حکومت کی تائید نہیں کرتا۔ اس کی وجہ ملک کا مغرب زدہ طبقہ اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ محض تجاہلِ عارفانہ کے طور پر "ملّا" کے اس طرزِ عمل پر حیرانی کا اظہار کرتا ہے۔ مگر اس میں نہ تو حیرانی کی کوئی بات ہے اور نہ کوئی ایسی پیچیدگی کہ حقیقت سمجھ میں نہ آتی ہو یا نہ آ سکتی ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ ملک کے مغرب زدہ طبقے کے نزدیک اچھائی اور بُرائی کا معیار یورپ اور امریکہ ہے۔ وہ زندگی کے تمام معاملات کا جائزہ مغربی اقدارِ حیات کے نقطۂ نظر سے لیتا ہے اور پھر ان کے مطابق

ہر کام کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ وہ خواہ زبان سے یہ بات نہ کہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام اُس کے نزدیک کوئی رہنما ضابطۂ حیات نہیں ہے۔ یہ جس حد تک مغربی تہذیب و تمدن کے ساتھ تم رکاب ہو کر چل سکے اُس حد تک تو گوارا ہے اور جس مقام پر ان دونوں کے راستے مختلف ہوں وہاں سے مغرب زدہ طبقہ اُسے چھوڑ کر مغرب کی پیروی اختیار کرتا ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ اپنے اس طرزِ عمل پر وہ عوام میں ہدفِ ملامت نہ بنے، اس لیے اسلام کو اپنے پیچھے گھسیٹنے کی مذموم کوشش کرتا ہے اور اس کو توڑ مروڑ کر اپنے نظریات کے مطابق ڈھالتا ہے۔ پھر جب دین کا علم رکھنے والے اس پر ٹوکتے ہیں اور نا قابلِ انکار دلائل سے ان کی من مانی تاویلات و تعبیرات کی غلطی واضح کرتے ہیں تو یہ جبر سے کام لے کر ان کو دبانا ہے اور نہایت ڈھٹائی کے ساتھ کہتا ہے کہ اسلام کی تعبیر کا حق کوئی ملّا کی میراث تو نہیں ہے۔

اسلام کی تعبیر بلاشبہ "ملّا" کی اجارہ داری نہیں مگر اس تعبیر کے لیے علم و واقفیت اور فکر و عمل کی اہلیت تو درکار ہے۔ دنیا میں کونسا ایسا علم و فن ہے جس میں ہر کس و ناکس کو اس کا ضروری علم حاصل کیے بغیر تعبیر کا حق دے دیا جاتا ہے۔ کیا فوج کے معاملات میں کسی ایسے شخص کو بولنے کا حق دے دیا جائیگا جو فوجی تنظیم و ترتیب اور فنِ حرب سے کوئی واقفیت نہ رکھتا ہو؟ کیا قانون کے معاملات میں غیر قانون دان، اور ڈاکٹری کے معاملات میں غیر ڈاکٹر، یا مالیات کے مسائل میں عام راہ چلتے کی رائے کو کوئی وزن دیا جائے گا؟ پھر دین کے معاملے میں ان لوگوں کی رائے کیسے وقیع ہو سکتی ہے جو نہ دین کا علم رکھتے ہیں نہ اس کے مطابق عمل کرتے نظر آتے ہیں؟ دین کی تعبیر کے لیے اہلیت کی اوّلین شرط یہ ہے کہ آدمی قرآن و سنت کا اتنا علم رکھتا ہو کہ وقت کے پیش آمدہ مسائل میں خدا اور اس کے رسول کی تعلیمات سے رہنمائی حاصل کر سکے۔ اور دوسری اتنی ہی اہم شرط یہ ہے کہ وہ عملاً اسلام کی پیروی کرنے والا ہو اور اس پر خود اس کی زندگی گواہی دے رہی ہو۔ جن لوگوں میں یہ دونوں ہی شرطیں مفقود ہوں، جنہوں نے اسلام کو جاننے اور سمجھنے میں اپنی عمرِ عزیز کا ہزارواں حصہ بھی نہ صرف کیا ہو، اور جو اپنی عملی زندگی میں فرائض تک کے پابند نہ ہوں، ان کا یہ حق آخر کیسے مانا جا سکتا ہے کہ وہ اسلام کی تعبیر کریں اور لوگ اسے

بے چون وچرا مان لیں؟ ظاہر بات ہے کہ اسلام کی تعبیر کا مقصد وقت کے تقاضوں کو اسلام کے مطابق ڈھالنا ہے نہ کہ اسلام کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا۔ جو لوگ بے چارے خود وقت کے تقاضوں میں ڈھلے ہوئے ہیں، اور صرف وقت کے ان تقاضوں ہی کو جانتے ہیں، اسلام کی الف ب تک نہیں جانتے، ان کے متعلق کوئی بگڑے سے بگڑا مسلمان بھی یہ نہیں مان سکتا کہ وہ اسلام کی صحیح تعبیر کرنے کے اہل ہیں۔ "عوام کالانعام" تو درکنار، اگر اس ملک کے صرف گریجویٹوں اور پوسٹ گریجویٹوں کی رائے بھی کسی ریفرنڈم کے ذریعہ سے معلوم کی جائے تو ان کی کم از کم ۹۰ فی صد تعداد اس مغرب زدہ طبقے کو اسلام کے معاملہ میں اتھارٹی ماننے سے انکار کر دے گی۔

اس مغرب زدہ طبقے کی تعبیرات کا انداز کتنا غلط اور ان کے مزاج میں کتنی مرعوبیت ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ دین کے کسی معاملے میں اُن کی کوئی تعبیر ایسی نہیں جس میں مغربی تہذیب کی جھلک نہ دکھائی دیتی ہو۔ اگر یہ تعبیر واقعی اسلام ہی کی تشریح و توضیح کے طور پر ہوتی اور زندگی کے معاملات پر احکامِ شریعت ہی کو صحیح طریقے سے منطبق کرنے کے لیے کی جاتی تو آخر کہیں تو ان کی تعبیرات مغربی معیارِ تمدن و تہذیب کے خلاف بھی ہوتیں، کیونکہ مغرب نہ سراپا حق ہے اور نہ ہو بہو اسلام ہے۔ اس لیے اسلام کی صحیح تعبیرات کا متعدد مقامات پر مغرب سے متصادم ہونا بالکل فطری بات ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان حضرات کے نظریات کسی ایک مقام پر بھی مغرب سے مختلف نہیں ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ کسی دینی مسئلہ کی تعبیر کرتے ہوئے ان کا ذہن مغرب کے سوا کسی دوسری طرف مائل ہی نہیں ہوتا؟ سُود، ضبطِ ولادت، پردہ، مخلوط تعلیم، عائلی قوانین، اور اسی نوعیت کے بیسیوں دوسرے مسائل میں مغرب ہی کو معیارِ حق سمجھ کر احکامِ شریعت کی تحریف کی جاتی ہے مگر نام اُسے تعبیر کا دیا جاتا ہے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ زندگی کے بعض معاملات میں جہاں شارع نے قطعی اور واضح احکام نہیں دیئے ہیں، تعبیر اور تشریح کی گنجائش ہے۔ ہمیں وقت کے تقاضوں اور اُن کی قوت اور اہمیت سے بھی انکار

نہیں ہے۔ مگر یہ بات سمجھنے سے ہم قاصر ہیں کہ جو تقاضے مغرب کے ہیں اُن کے علاوہ بنی نوع کے اور کوئی تقاضے نہیں اور حسن و قبیح کا جو معیار مغرب نے مقرر کیا ہے اُس کے سوا کوئی دوسرا معیار نہیں۔ ہمارے ہاں فقہاء نے بعض مسائل کی کتنی ہی مختلف تعبیرات پیش کی ہیں اور اُن کے درمیان اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ مگر ان میں سے کسی ایک تعبیر کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی جو ذہنی مرعوبیت کا نتیجہ ہو اور پھر اُسے امت نے قبول بھی کر لیا ہو۔ آج شراب اور سُود کو حلال کرنے کے لیے جو دُور از کار دلائل دیئے جاتے ہیں اور اس معاملے میں ایڑی چوٹی کا جو زور صرف کیا جاتا ہے وہ صرف اس لیے کہ اس دَور کی غالب تہذیب میں ان دونوں برائیوں کا عام رواج ہے۔ یہ برائیاں کوئی نئی تو نہیں۔ بگڑے ہوئے لوگ ہر زمانے میں ان کا ارتکاب کرتے رہے ہیں۔ مگر آج تک کسی مسلمان مفتی نے جسے فی الواقع امت نے مفتی مانا ہو، انہیں جائز قرار دینے کی جرأت نہیں کی۔ کیا ان صلحاء امت پر حالات کا کوئی دباؤ نہ تھا؟

"ملّا" جس وجہ سے گردن زدنی ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب سے مرعوب نہیں ہے اور ذہنی غلامی کا قلادہ اس نے اپنی گردن میں نہیں ڈالا ہے۔ وہ تنگ نظر اور متعصب نہیں ہے کہ آپ مغرب سے واقعی کوئی مفید چیز لائیں اور وہ خواہ مخواہ اس کی مخالفت کرے۔ وہ اگر برسرِ اقتدار طبقے کے کسی اقدام پر ٹوکتا ہے تو صرف اس لیے کہ اُسے اقدار کا وہ سارا نظام درہم برہم ہوتا نظر آتا ہے جس سے دینِ حق عبارت ہے۔ سارا فرق زاویۂ نگاہ کا ہے۔ مغرب زدہ طبقہ مادّی تہذیب کے زیر اثر جن باتوں کو انتہائی ضروری سمجھتا ہے اُن میں سے بہت سی باتیں "ملّا" کی نظر میں غیر ضروری، اسلام سے متصادم، اور فی الحقیقت مفید ہونے کے بجائے اُلٹی نقصان دہ ہیں۔ ہم وضاحت کے لیے اُن دو مسائل کو لیتے ہیں جن کی طرف مکتوب نگار نے خاص طور پر اشارہ کیا ہے، یعنی "ملّا" نے خاندانی منصوبہ بندی اور عائلی "اصلاحات" جیسے مفید منصوبوں کو غیر شرعی قرار دے کر انہیں عوام میں نامقبول بنانے کی کوشش کی۔

مکتوب نگار کے نزدیک یہ "ملّا" کی حماقت اور جہالت ہے کہ وہ خاندانی منصوبہ بندی کی مخالفت کرتا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک یہ دین سے ملّا کی واقفیت ہی کی نہیں بلکہ اس کی عاقبت اندیشی، فرض شناسی اور حالات سے گہری واقفیت کی دلیل بھی ہے۔ وہ دین کے مزاج کو اچھی طرح سمجھنے کی وجہ سے اس بات کو جانتا ہے کہ مسلم معاشرے میں اخلاق کی اہمیت ہر دوسری چیز سے زیادہ ہے۔ غربت اور افلاس اُس کے نزدیک بھی کوئی پسندیدہ چیزیں نہیں ہیں۔ وہ بھی اس بات کا خواہاں ہے کہ عوام کی بنیادی ضروریات بطریقِ احسن پوری ہوں، اور سوسائٹی کے ہر فرد کو آرام اور سکون میسّر ہو۔ مگر وہ کبھی اس بات پر آمادہ نہیں ہو سکتا کہ غربت کو دُور کرنے کے لیے کوئی ایسا ذریعہ اختیار کیا جائے جس سے معاشرے میں فحاشی پھیلنے لگے۔ افلاس کو دُور کرنے کے لیے بہت سی تدابیر ممکن ہیں جنہیں حکومت کو اختیار کرنا چاہیے۔ آخر یہ کیوں فرض کر لیا گیا ہے کہ جب تک خاندانی منصوبہ بندی کا عام رواج نہ ہو اس وقت تک اس مرض کا علاج ناممکن ہے؟ صرف "ملّا" ہی نہیں، مغرب زدہ طبقہ بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ مغربی ممالک میں جب اس کا رواج ہوا تو اباحیت کا ایک ایسا خوفناک طوفان اٹھا جس نے اہلِ مغرب کی ساری اخلاقی قدروں کو برباد کر کے رکھ دیا۔ "ملّا" کے نزدیک اخلاق کی یہ اقدار مادی خوشحالی سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں اس لیے وہ ہر قیمت پر ان کی محافظت و پاسبانی کرنا چاہتا ہے۔ علاوہ بریں معاشی اور تمدنی حیثیت سے بھی خاندانی منصوبہ بندی کی پوری اسکیم معاشرے کے لیے سخت نقصان دہ ہے جس کے دلائل پوری تفصیل کے ساتھ "اسلام اور ضبطِ ولادت" میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ مگر یہ مغرب زدہ طبقہ دلیل کا جواب دلیل سے دینے کی ہمت نہیں رکھتا۔ اس کے پاس دلیل کا جواب صرف طاقت ہے۔

ہر نظامِ حیات اقدار کا اپنا ایک الگ اور منفرد ڈھانچہ رکھتا ہے جو اسے دوسرے نظاموں سے ممیز اور ممتاز کرتا ہے۔ یہ اقدار اُس نظام کے مختلف شعبوں کے مابین نہ صرف ربط قائم رکھنے کا ذریعہ ہوتی ہیں بلکہ اُس کی اہمیت متعیّن کرنے کا پیمانہ بھی ہوتی ہیں۔ مغربی معاشرے میں جو چیزیں

پسندیدہ ہیں، ضروری نہیں کہ مسلم معاشرے میں بھی وہ قابلِ قدر ہوں۔ جب دونوں معاشرے مقاصدِ حیات اور اصول اور مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو لامحالہ اُن کے سوچنے سمجھنے کے انداز، اُن کے اخلاقی معیارات، اُن کے خوب و ناخوب کے پیمانوں میں بھی فرق ہونا چاہیے۔ عائلی قوانین، جن کو یہ لوگ عائلی "اصلاحات" کہتے ہیں اور جنہیں نافذ کرکے داد طلب نگاہوں سے اہلِ مغرب کی طرف دیکھتے ہیں، ان کا بنیادی نقص یہی ہے کہ ان میں نکاح و طلاق کے متعلق مغربی نظریات کو لاکر خواہ مخواہ اسلامی قانون میں ٹھونس دیا گیا ہے، اور اپنی جگہ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ ایک "اصلاح" ہے جو اسلامی قانون میں کی گئی ہے۔ "ملّا" کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ ہر معاملے میں مغرب کی اندھی پیروی کے بجائے اسلامی شریعت کے اصول و احکام اور مقاصد کو سامنے رکھتا ہے جو اُمتِ مسلمہ کے پیشِ نظر ہونے چاہییں اور حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں کے درمیان اسلام نے جو تناسب قائم کر رکھا ہے اُس میں خلل اندازی کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اسلامی شریعت "اصلاح طلب" ہے اور اس کے اندر مغربی نظریات کے مطابق اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔

"ملّا" بیچارے پر یہ الزام بھی ہے کہ اُس نے ملک میں حکومت در حکومت قائم کر رکھی ہے۔ اس حکومت در حکومت کا آخر مطلب کیا ہے؟ جو طبقہ یہ الزام لگا رہا ہے، اقتدار بالکلیہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ فوج، پولیس، ملکی نظم و نسق، سب اس کے قبضے میں ہے۔ ملک کی معاشی زندگی پر اس کا کنٹرول ہمہ گیری کے ساتھ قائم ہے۔ قانون سازی کی پوری مشینری، بنیادی جمہوریتوں سے لے کر اسمبلیوں تک اس کی گرفت میں ہے۔ پریس اور پلیٹ فارم، دونوں کو اس نے مکمل طور پر اپنے قابو میں لے رکھا ہے۔ یہ سب کچھ کر لینے کے بعد اب باقی کیا رہ گیا ہے جہاں "ملّا" نے حکومت در حکومت قائم کر رکھی ہے؟ باقی صرف یہ رہ گیا ہے کہ ابھی قوم کا ضمیر زندہ ہے، اس میں کچھ لوگ غلط کو غلط کہنے والے موجود ہیں، اور قوم اس حد تک غلام نہیں بنی ہے کہ ہر آواز جو اقتدار کے مرکز سے اٹھے اس پر بے چون و چرا آمنا و صدقنا کہہ دے۔ اس چیز کو "حکومت در حکومت" کا نام دے کر خطرے کی گھنٹیاں بجائی جا رہی ہیں۔ مدّعا یہ ہے کہ پوری

قوم کو اقتدار کے آگے سربسجود ہونا چاہیے۔ اگر ایک زبان بھی اقتدار کی کسی بات کو غلط کہنے والی اور ایک کان بھی اس کو سننے والا موجود ہے تو یہ "حکومت در حکومت" ہے جسے ختم کیے بغیر وحدہٗ لاشریک حکومت کا لطف حاصل نہیں ہو سکتا۔

جن حالات اور جن مقاصد کے تحت اس ملک میں مارشل لا نافذ کیا گیا وہ سب کے سامنے ہیں۔ قوم کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے اور اُسے معائب سے پاک کرنے کے لیے یہ وہ انتہائی قدم تھا جو اٹھایا گیا۔ اس سے ملک کے سارے اختیارات ایک ذات میں متنقل ہو گئے۔ اُسے اس بات کی پُوری آزادی دی گئی کہ وہ جس طرح چاہے قوم کی بگڑی سنوارے۔ قریب قریب دس سال بلاشرکت غیرے حکمرانی کرنے کے بعد اب جو نتائج سامنے آ رہے ہیں وہ قوم کی امیدوں سے بہت کم ہیں۔ اتنے غیر معمولی اختیار کے بعد قوم بہتر ثمرات کی توقع رکھتی تھی۔ اس چیز نے اُس کے اندر افسردگی پیدا کر دی ہے۔ ان حالات میں انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ کامیابیوں اور ناکامیوں کا بے لاگ جائزہ لیا جاتا اور جہاں جہاں معاملات کو سمجھنے اور مسائل کو حل کرنے میں غلطی سرزد ہوئی تھی اس کا برملا اعتراف کیا جاتا اور پوری قوم کو اعتماد میں لیکر اُس کے تدارک کی فکر کی جاتی۔ مگر یہاں کیا یہ جا رہا ہے کہ ناکامیوں کا سارا غصہ غریب "ملّا" پر نکال کر عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ سب کچھ اسی کم بخت کی مخالفت کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ راستے میں حائل نہ ہوتا تو بڑے مفید نتائج برآمد ہوتے۔ سوچنے کا یہ انداز کسی حقیقت پسند اور حق شناس انسان یا گروہ کو زیب نہیں دیتا۔ آپ خاندانی منصوبہ بندی کے اس پروگرام کو ہی دیکھیے۔ اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے ۲۴ کروڑ روپے کی خطیر رقم مختص کی گئی اور اس کا پرچار کرنے اور اس کی عملی تعلیم دینے کے لیے ڈاکٹروں، نرسوں اور دوسرے کارندوں کی ایک فوج میدان میں لا کر ڈال دی گئی۔ اخبارات میں اس "مفید پروگرام" کے جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ پروگرام شادی شدہ جوڑوں میں مقبول ہونے کے بجائے غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں میں مقبول ہوا ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ شادی شدہ افراد غیر شادی شدہ لوگوں کی بہ نسبت "ملّا" کے زیادہ زیر اثر ہیں؟ انہیں خود اپنی فلاح و بہبود کا

کوئی احساس نہیں کہ ایک "مفید" چیز کو قبول نہیں کرتے؟ مُلّا کی اس وقت جو حالت ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ بے زر، بے زور اور بے یار و مددگار طبقہ حکومت کے عزائم کو ناکام بنانے کی قدرت رکھتا ہے۔ درحقیقت خاندانی منصوبہ بندی کا یہ پروگرام مُلّا کی مخالفت کی وجہ سے ناکام نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی ناکامی کی بڑی وجہ قوم کے مزاج سے عدم واقفیت اور اس کے دینی احساسات سے ناآشنائی ہے۔ اور جہاں یہ کامیاب ہو رہا ہے (یعنی غیر شادی شدہ لوگ) وہاں یہ مُلّا کی مخالفت کے باوجود خوب کامیاب ہو رہا ہے، کیونکہ اس کی پُشت پر نفسیاتی اسباب کام کر رہے ہیں۔

"مُلّا" کو حکومت در حکومت کے قیام کا اس بنا پر بھی مجرم ٹھیرایا گیا ہے کہ اس نے اپنا ایک الگ نظامِ تعلیم رائج کر رکھا ہے جو اسے قوت و اقتدار بہم پہنچاتا ہے۔ اس نظام کے تحت ایک ہزار برس قبل کا مرتب کردہ "ایک دقیانوسی فرسودہ اور علمی لحاظ سے افلاس زدہ نصاب" پڑھایا جاتا ہے جس کے تمام علوم قیاسی اور ظنی ہیں، کیونکہ ان کی بنیاد ارسطو کی منطق استخراجیہ پر رکھی گئی ہے اور مسلّم حکماء کے تحقیق کردہ اصول استقرار کو اس میں جگہ نہیں دی گئی۔ اس ضمن میں صدرِ مملکت کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ ان سب مدارس کو ختم کر کے محکمہ اوقاف کے زیرِ نگرانی ایسے دار العلوموں کا قیام عمل میں لایا جائے جن میں عصرِ حاضر کے تقاضوں اور علوم سے باخبر مذہبی رہنما تیار کیے جائیں تاکہ امتِ مسلمہ میں "حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کا درس دینے والے سیاسی طالع آزماؤں" کی تخلیق بند ہو جائے۔

حکومت کو یہ مشورہ بھی اس لیے دیا جا رہا ہے کہ تعلیم و تربیت کا پورا نظام براہِ راست اُس کی تحویل میں چلا جائے اور کوئی آزاد تعلیمی نظام باقی نہ رہنے دیا جائے تاکہ ایک کامل ہمہ گیر ریاست (TOTALITARIAN STATE) کے مقاصد اچھی طرح پُورے ہو سکیں۔ یہ کام فکر و نظر کو جلا دینے کے لیے نہیں بلکہ افکار و جذبات کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کے لیے درکار ہے۔ اس مغرب زدہ طبقے کو اپنی روشن خیالی پر بڑا فخر و ناز ہے مگر وہ اس سادہ سی حقیقت کو بھی جاننے سے قاصر ہے کہ جو قوم اپنے افراد کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے اور اُن کی تخلیقی قوتوں کو اُبھارنے کا داعیہ رکھتی ہو وہ شعُور د

احساس کو زیادہ سے زیادہ آزاد فضا مہیا کر کے اُسے پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ نظام تعلیم پر حکومت کی مکمل اجارہ داری کو کبھی کسی ہوشمند قوم نے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر فکری اور جذباتی اعتبار سے انسانوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھال دیا جائے اور کسی وجہ سے اس مخصوص فکر اور احساس کو زوال آجائے تو قوم کے احیاء کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی دانشمند قومیں اپنے ہاں ہر قسم کے نظامِ تعلیم کو بشرطیکہ وہ اُس کے اساسی تخیل کو برباد کرنے والا نہ ہو، نہ صرف برداشت کرتی ہیں بلکہ اُس کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ انگلستان اور امریکہ کی بڑی بڑی یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے حکومت کے اثر سے بالکل آزاد ہیں اور وہ اپنے نہج پر نوخیز نسلوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے ہیں۔ ان اداروں کی بیشتر تعداد ایسی ہے جنہیں کلیسا، معابد، یا مذہبی تنظیمیں بڑی کامیابی کے ساتھ چلاتی ہیں۔ ان تعلیمی مراکز کو باشعور قومیں اپنے ہاں کے نخلستان سمجھتی ہیں جن میں انسان کو آزادی اور سکون کا ماحول نصیب ہوتا ہے۔ آکسفورڈ نے اس آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے جتنی قربانی اور جرأت کا ثبوت دیا ہے وہ کسی صاحبِ علم سے پوشیدہ نہیں۔ تعلیمی جکڑ بندیاں تو دورِ جدید کے آمرانہ رجحانات کے شاخسانے ہیں۔

مذہبی مدارس اور دارالعلوموں میں مروجہ نصاب کا ذکر مغرب زدہ طبقہ جس نفرت اور حقارت سے کرتا ہے اُس سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ اس طبقے کے اکثر و بیشتر افراد نے اس نصاب کو باقاعدہ پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ دقیانوسی، فرسودہ اور علمی لحاظ سے افلاس زدہ ہے۔ ہم پورے وثوق سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اس طبقہ کا یہ دعویٰ اس نصاب کے بارے میں یکسر بے خبری پر مبنی ہے۔ وہ اس نصاب کی ابجد تک بھی نہیں جانتا اور یونہی اس کے بارے میں بے سروپا باتیں کرتا رہتا ہے۔

یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے کہ ہر قدیم چیز فرسودہ اور ہر پرانا نظریہ بیکار ہے۔ حکمت اور دانائی کی بات جس طرح کسی خاص طبقے کی اجارہ داری نہیں بالکل اسی طرح یہ کسی خاص عہد کی بھی میراث نہیں۔ پرانے زمانے میں بھی اہلِ علم نے بعض ایسے افکار اور ایسی تخلیقات پیش کی ہیں جو آج بھی علم و حکمت کی اساس تصور کی جاتی ہیں۔ شیکسپیئر کے ڈرامے، چاسر، ملٹن، پوپ اور ڈرائیڈن کی نظمیں آج بھی انگریزی ادب کا سب سے

بیش قیمت سرمایہ ہیں اور کوئی شخص ان سے کما حقہٗ واقفیت حاصل کیے بغیر انگریزی زبان اور ادب کی نزاکتوں کو سمجھ نہیں سکتا۔ اسی طرح فلسفے اور سیاسیات میں آج بھی افلاطون اور ارسطو کے نظریات بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پورے یورپی ادب اور حکمت کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا سرچشمہ یونان کے قدیم مفکرین کے تصورات ہیں۔ "روشن خیال یورپ" تو انہیں اپنے نصاب میں بطور بنیاد شامل کر کے نوخیز نسلوں کے دل و دماغ پر ان کے نقوش مرتسم کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے، مگر ہم کسی قدیم بات کے محض اس لیے دشمن ہیں کہ اس کا تعلق ماضی سے ہے۔ اس طرزِ فکر کا اصل محرک یہ نہیں ہے کہ ہمارے قدیم علوم فرسودہ ہیں بلکہ اس کا اصل مقصود نوجوانوں کے ذہن میں ماضی کے خلاف نفرت پیدا کر کے اُس سے اُن کا فکری اور جذباتی رشتہ کاٹ دینا ہے۔ مغربی یونیورسٹیوں میں اگر شیکسپیئر اور ملٹن کی کتابیں داخلِ نصاب ہوں اور افلاطون اور ارسطو کے خیالات سے طلبا کو پوری طرح آشنا کرنے کا انتظام ہو تو یہ روشن خیالی اور عقل پسندی ہے، لیکن اگر عربی مدارس میں جلالین، بیضاوی، صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد، نسائی، ہدایہ، دیوان حماسہ، دیوان متنبّی اور مقامات حریری پڑھانے کا انتظام ہو تو یہ سراسر جہالت ہے!

جو شخص تعلیمی مسائل کی معمولی سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہے وہ اس بات سے واقف ہے کہ نصاب کی ترتیب میں صرف یہ چیز پیشِ نظر رکھی جاتی ہے کہ ایسی کتابیں درسًا پڑھائی جائیں جو طلبا کے اندر ٹھوس علمی استعداد پیدا کر کے انہیں خود اعتمادی کے ساتھ مزید تحقیق کے لیے تیار کر سکیں۔ مجھے قدیم اور جدید دونوں مدارس میں تھوڑی مدّت پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں یہ بات بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ درسِ نظامی کا نصاب ٹھوس علمی قابلیت پیدا کرنے کے اعتبار سے جدید مدارس کے نصاب سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ اس نصاب کو اگر اچھے طریقہ سے پڑھ لیا جائے تو قرآن و سنّت اور فقہ اسلامی کو سمجھنے کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں اور وہ پھر اُس طرح کی ٹھوکریں نہیں کھاتا جو آج کے متجددین بڑی بڑی ڈگریاں رکھنے اور لمبی چوڑی تحقیقات کے دعووں کے باوجود اکثر و بیشتر کھاتے رہتے ہیں۔ جن باتوں کو یہ حضرات چند فقہی اور

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

لغوی موشگافیاں کہتے ہیں انہی سے تو فہم دین پیدا ہوتا ہے اور اللہ اور اُس کے رسول کے منشا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان حضرات نے کبھی اس نصاب کو پڑھا ہو تو انہیں یہ معلوم ہو کہ یہ باتیں کتنی ضروری ہیں۔

جدید تعلیم یافتہ طبقے کو اس بات پر بڑا ناز ہے کہ وہ کبھی آنکھیں بند کر کے کوئی چیز قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ مگر ان حضرات کی عملی حالت یہ ہے کہ جو بات کسی نے ایسی کہہ دی جس سے ان کے خیالات کو تقویت ملتی ہو وہ اُسے بلا سوچے سمجھے کہتے چلے جاتے ہیں۔ یُوں تو اس امر کی وضاحت کے لیے بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، مگر میں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں جو ہمارے روشن خیال مکتوب نگار نے اپنے خط میں درج کی ہے۔ اُن کا ارشاد ہے کہ ہمارے علوم قیاسی اور ظنّی ہیں، کیونکہ ان کی بنیاد ارسطو کی منطق استخراجیہ پر رکھی گئی ہے اور مسلم حکماء کے تحقیق کردہ اصول استقراء کو اس میں کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ یہ بات بھی ایک مُسلّم مفکّر کی محض کورانہ تقلید میں کہی جا رہی ہے، حالانکہ اس کا حقیقت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ اقبال مرحوم نے جن کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے، یہ بات ایک خاص مقصد اور ایک خاص الزام سے بچنے کے لیے کہی تھی۔ مغربی مفکّرین وحی و الہام کو قیاسی باتیں کہہ کر اسلامی عقائد اور اسلامی تعلیمات کا استخفاف کرتے تھے۔ اقبال نے اُن کے اس الزام کے رد میں یہ موقف اختیار کیا کہ مُسلم حکماء کی تحقیق کی بنیاد منطق استخراجیہ کے بجائے اصولِ استقراء پر ہے۔ اس لیے اس میں ظن و قیاس کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ بس اقبال کا اس طرف اشارہ کرنا تھا کہ ماضی کے سارے علوم و فنون پر قیاسی اور ظنّی ہونے کا الزام چپکا دیا گیا اور کسی نے یہ سوچنا تک گوارا نہ کیا کہ اس میں حقیقت کا کس قدر عنصر شامل ہے۔

حقیقت کو جاننے اور اُس کا ادراک کرنے کے لیے منطق استخراجی اور استقرائی دونوں ضروری ہیں۔ جس طرح کوئی فرد ایک پاؤں پر چل نہیں سکتا اسی طرح کوئی قوم بھی صرف ایک منطق کا سہارا لے کر تحقیق کے میدان میں ترقی نہیں کر سکتی۔ بعض معاملات میں اصول کے عملی اطلاق سے اس کی حقیقت ذہن نشین ہوتی ہے، اور بعض مقامات پر زندگی کے مشاہدات کسی اصول کے مرتب کرنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ فاضل مکتوب نگار اس حقیقت سے تو واقف ہی ہونگے کہ دنیا کی کوئی قوم جو بعض اَن دیکھے حقائق پر

ایمان رکھتی ہے وہ منطق استخراجیہ کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کر سکتی۔ اُسے اصول سے فروع اخذ کرنے اور مختلف مسائل کے استنباط میں اس سے لامحالہ مدد لینا پڑتی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اصول استقراء کی ہمارے ہاں جو بے جا مدح و توصیف ہوتی رہتی ہے اس کی وجہ اصول استخراج کے مقابلے میں اس کی غیر معمولی افادیت نہیں بلکہ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اس میں تجربے اور مشاہدے کو اساس بنا کر اصول مرتب کیے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی فعل یا عمل کے محمود و مذموم ہونے کا فیصلہ مادّی اعتبار سے اس کی افادیت یا ضرر رسانی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ افادی نظریۂ اخلاق (UTILITARIAN VIEW OF MORALS) نے اسی منطق کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔

مکتوب نگار نے نظریۂ خروج کو بھی لیا ہے اور حکومت کی توجہ مخدومی مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "خلافت و ملوکیت" کی طرف مبذول کروا کر اُسے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ شخص کسی دنوں وقت پر جب کامیابی کی پوری توقع ہو، اُن مسلم حکومتوں کے خلاف بغاوت کر دینا نہ صرف جائز بلکہ واجب سمجھتا ہے جو اس کے خیال میں منہاجِ نبوت پر قائم نہ ہوں۔ پھر آگے چل کر برسرِ اقتدار طبقے کے جذبات بھڑکانے اور انہیں برانگیختہ کرنے کے لیے حکومت کو واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ اس شخص کے نزدیک پاکستان کی موجودہ حکومت جاہلیت کی حکومت کے مترادف ہے جس کے خلاف خروج جائز ہی نہیں واجب ہے، محض سازگار حالات کا انتظار کر لینا چاہیے۔ اس کے بعد مکتوب نگار اپنے حقیقی مدعا کی طرف آتے ہیں اور حکومت سے پُرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ بغاوت کے حق میں اس فتوے کے بعد ہر صاحبِ اقتدار کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس ملائی نظام کی قوت توڑنے کی بھرپور کوشش کرے۔

مولانا کی طرف یوں تو بیشمار غلط باتیں پہلے بھی منسوب کی جاتی رہی ہیں اور اب بھی ان کا سلسلہ جاری ہے مگر ہم یہ بات کہنے پر مجبور ہیں کہ اُن پر یہ الزام وہی شخص لگا سکتا ہے جس کے دل میں خدا اور خلق کسی کا خوف باقی نہ رہا ہو۔ مولانا محترم کوئی خفیہ عزائم نہیں رکھتے۔ انہوں نے اپنے ارادہ اور مقاصد کو پوری وضاحت کے

ساتھ عوام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ نہ صرف اس ملک میں بلکہ اس ملک سے باہر ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں نے اُن کی فکر انگیز تصنیفات کو دیکھا ہے اور وہ سب اس بارے میں مولانا اور جماعت اسلامی کے موقف سے واقف ہیں۔ انہوں نے ایک مقام پر نہیں بلکہ ہر جگہ مسلم ممالک کے لوگوں کو یہی تلقین کی ہے کہ وہ اپنے طریق انقلاب کو اب بدل ڈالیں اور فوج اور پولیس اور خفیہ سازشوں کے بل بوتے پر تختِ اقتدار چھیننے کے بجائے رائے عامہ کی مدد سے نظامِ حکومت میں پُرامن تبدیلیوں کی راہ اختیار کریں، کیونکہ طاقت کے بل پر زبردستی جو انقلاب آتا ہے وہ اپنے ساتھ ایسے بیشمار مفاسد لاتا ہے جن سے پھر چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ مولانا محترم اس بات کے کس حد تک دل و جان سے قائل ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُن کی رہنمائی میں جماعت نے اپنی جدوجہد کے لیے جو دستور مرتب کیا ہے اُس میں اس چیز کو بطور اصول داخل کیا گیا ہے کہ جماعت اسلامی جمہوری و آئینی طریقوں سے علانیہ کام کرے گی اور نظامِ زندگی میں جو تبدیلی وہ لانا چاہتی ہے اس کے لیے پُرامن طریقہ سے جدوجہد کرے گی تاکہ تبلیغ، تلقین، اشاعتِ افکار اور سیرتوں کی اصلاح سے رائے عام ان تبدیلیوں کے لیے ہموار ہو جو جماعت کے پیشِ نظر ہیں۔

باقی رہی "خلافت و ملوکیت" میں نظریۂ خروج کی بحث تو وہ دراصل فقہ اسلامی کے اِس خاص مسئلے سے تعلق رکھتی ہے کہ آیا ظالم امراء کے خلاف کسی حالت میں خروج کرنا جائز ہے یا نہیں۔ اس علمی بحث میں "خلافت و ملوکیت" کے مصنف نے ایک طرف ان فقہاء و محدثین کا مسلک بیان کیا ہے جو خروج کو جائز نہیں رکھتے، اور دوسری طرف امام ابوحنیفہ کے مسلک کی تشریح کی ہے جن کے نزدیک بعض خاص شرائط کے ساتھ خاص حالات میں یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ واجب ہے۔ اس خالص علمی بحث میں انہوں نے دونوں مسلک پُورے حوالوں کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں۔ اگر صرف اس چیز کو بیان کر دینا ہی اتنا خوفناک ہے کہ اس پر خطرے کی گھنٹی بجا دی جائے تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ خود امام ابوحنیفہ اگر اس زمانے میں موجود ہوتے، یا اُن سے پہلے امام حسینؓ کا زمانہ مکتوب نگار پا لیتے، جنہوں نے عملاً خروج کیا تھا، تو ان کے بارے میں مکتوب نگار کی سفارشات کیا ہوتیں۔

یہ دراصل کوئی بڑا پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے۔ کوئی شخص سمجھنا چاہے تو بڑی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ فقہ اسلامی میں اس کی نوعیت کیا ہے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا دین صرف انفرادی معاملات ہی میں ہم کو رہنمائی نہیں دیتا بلکہ اجتماعی مسائل اور امورِ مملکت میں بھی حق و صداقت کا راستہ دکھاتا ہے۔ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت اور صحابۂ کرام کے تعامل میں ہم کو اسلامی حکومت کے مقاصد اور اصول اور طریقِ کار کے متعلق واضح ہدایات ملتی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تختِ اقتدار پر متمکن ہو کر اگر ایک ظالم و جابر حکمراں ان ہدایات کے خلاف کام کرنے لگے اور خلقِ خدا پر ظلم ڈھانے لگے تو ان حالات میں عوام کو کیا کرنا چاہیے؟ اس کے بارے میں قرآن و سنت کے گہرے مطالعہ کے بعد فقہاء امت نے مختلف آراء ظاہر کی ہیں اور ان میں سے ایک رائے کسی معمولی شخص کی نہیں بلکہ امام اعظم کی یہ ہے کہ اگر وہ یہ محسوس کریں کہ اس حکمراں کو ہٹانے سے فتنہ و فساد کا بازار اور زیادہ گرم ہوگا اور عوام پر زیادہ مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑیگا تو انہیں صبر کے ساتھ اُسے برداشت کرنا چاہیے اور اللہ سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ اس مصیبت سے انہیں نجات دلائے لیکن اگر ایسے اسباب و ذرائع فراہم ہو جائیں جن سے اس ظالم کو ہٹا کر ایک عادل حکومت قائم ہو سکتی ہو تو اس کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ بعض حالات میں واجب ہے۔ خدا بتائے کہ اس میں کون سی غلط اور غیر معقول بات ہے؟ ماضی میں جب مسلمان ممالک پر خاندانی بادشاہتوں کا اقتدار قائم تھا اور بعض اوقات بگڑے ہوئے بادشاہ عوام پر عذاب بن کر مسلط ہو جاتے تھے تو اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس کے سوا اور کونسا معقول راستہ ممکن تھا؟ مگر ظاہر ہے کہ یہ اصول اس عہد کے لیے صحیح تھا جب اقتدار کی تبدیلی میں رائے عامہ کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ اب جبکہ ایک مقررہ ضابطہ کے مطابق عوام کی مرضی سے حکومت کرنے والے ہاتھ بدلے جا سکتے ہیں تو تبدیلی کا وہ طریقہ غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ وہ کوئی مستحسن نہ تھا بلکہ اصلاحِ حال کی ایک ناگزیر صورت تھی جسے کڑی شرائط کے ساتھ بعض مخصوص حالات میں اختیار کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس علمی بحث کو لیکر یہ کہنا کہ مولانا مودودی آج ملک کے برسرِ اقتدار طبقے کے خلاف خروج کو واجب قرار دیتے ہیں اگر انتہائی بددیانتی نہیں تو اور کیا ہے؟

گستاخی نہ ہو تو ہم مکتوب نگار کی خدمت میں عرض کرینگے کہ وہ اگر فقہائے امت کی بحثوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں تو جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب کی سیاسی سوانح حیات (FRIENDS NOT MASTERS) کا مطالعہ ضرور فرمائیں خصوصاً اس کتاب کا پانچواں اور چھٹا باب انہیں اس مسئلہ کے سمجھنے میں بے حد مدد دیگا اور ان کی وہ ساری وحشت دور

ہو جائیگی جو "خلافت و ملوکیت" میں اس بحث کو پڑھکر انہیں لاحق ہوئی ہے۔ ان ابواب میں صدرِ مملکت نے یہ بتایا ہے کہ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۸ء تک ملکی حالات بڑی سرعت کے ساتھ بگڑتے رہے یہاں تک کہ ملک تباہی کے گڑھے پر پہنچ گیا۔ پہلے ملک غلام محمد نے مجھے ملک کی عنانِ اختیار سنبھالنے کی پیشکش کی مگر میں اس وقت فوج کی تنظیم اور اس کو دفاع کے لیے تیار کرنے میں مشغول تھا۔ میں نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا پھر حالات اور زیادہ بگڑتے چلے گئے۔ آخر کار میں نے اس امر کا فیصلہ کر لیا کہ اب اقتدار کو سنبھال ہی لینا چاہیے۔ اس سلسلے میں اُن کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں:

"اس انقلاب پر میرا ردِ عمل یہ تھا کہ یہ بڑی بدنصیبی ہے کہ ملک میں ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں جنہوں نے اس سنگین اقدام کو ناگزیر بنا دیا ہے۔ ایسے معاملات میں الجھنا کوئی خوش کن بات نہیں مگر اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ ملک کے بچاؤ کے لیے یہ آخری کوشش تھی۔" (صفحہ)

فیلڈ مارشل صاحب نے اسی ضمن میں یہ بھی بتایا ہے کہ انہیں اس بات کی پوری توقع تھی کہ ان تشویشناک حالات میں اگر انہوں نے کوئی اقدام کیا تو وہ کامیاب ہونگے۔ اس بارے میں بھی اُن کے تاثرات ملاحظہ فرمائیں:

"ہمیں اس بات کا یقین کامل تھا کہ ہمارا یہ اقدام کامیاب ہوگا۔ . . مجھے اس امر کا احساس تھا کہ اگر کسی طرف سے کوئی مزاحمت ہوئی تو وہ برائے نام ہوگی اور ہم اس سے جلد ہی نمٹ لیں گے۔ . . عوام ان حالات سے سخت تنگ آ چکے تھے اور وہ ہر قیمت پر اقتدار کے ہاتھوں کی تبدیلی دیکھنا چاہتے تھے۔" (صفحہ)

فیلڈ مارشل صاحب کی اس رائے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر ایک جمہوری اور دستوری حکومت میں بھی حالات بگڑ جائیں، اور کوئی شخص طاقت کے ذریعہ سے کامیاب انقلاب برپا کر سکتا ہو تو ایسا کرنا نہ صرف جائز ہے، بلکہ خود فیلڈ مارشل صاحب نے یہ کام کر کے اس کے حلال ہونے پر اپنی مہر ثبت کر دی ہے۔ پھر ۱۹۵۸ء کے انقلاب کے بعد سپریم کورٹ کے ایک مقدمہ میں اُس وقت کے چیف جسٹس محمد منیر صاحب نے قانون کا یہ فتویٰ بھی ثبت کر دیا ہے کہ "ایک کامیاب انقلاب سے دستور میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے"۔ اب مکتوب نگار صاحب فرمائیں کہ جب ایک جمہوری اور دستوری مملکت تک میں یہ جائز ہے تو ماضی میں جب بادشاہتیں قائم تھیں اور انہیں تبدیل کرنے کا کوئی آئینی راستہ سرے سے موجود ہی نہ تھا، اُس وقت اقتدار کی تبدیلی کے لیے طاقت کے استعمال کا جواز بیان کرنا آخر کس لحاظ سے جرم ہے؟ اور اگر اس کا بیان تک جرم ہے تو مکتوب نگار ایک دفعہ پھر سوچ لیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور اس کی زد کہاں کہاں تک پہنچتی ہے۔